ڈاکٹر میمونہ سبحانی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

مسعود اشعر بحیثیت مترجم

Dr. Mamuna Subhani
Assistant Professor, Department of Urdu, Government College University Faisalabad

Masood Ashar as Translator

Translation is an important type of literature that connects the world with one another through the exchange of ideas, knowledge, and wisdom. Masood Asher belongs to an Urdu literature community that gave priority to translation over other kinds of literature. In addition to being a translator, he is also a novelist and journalist. Masood Asher was an active journalist in the Zia-ul-Haq era. As a journalist, he faced difficulties but wrote short stories to convey his message. So his writings also describe his relationship with society. He studied several books in English and transferred their ideas to our language while also maintaining our cultural diversity. This article will discuss his translation skills, analyzing his selection of topics, and the transfer of literature from other writers.

Keywords: *Literature, Culture, Translation, Enhancing language, Recognition.*

زمانہ قدیم ہو یا جدید ہر دور میں علم کی طلب اور اخذ و اکتساب کا عمل جاری رہا ہے۔ اس عمل کو جاری رکھنے میں مختلف محققین، شاعروں، ادیبوں اور ترجمہ نگاروں کی کوشش بنیادی ترجیحات کی حامل رہی ہیں۔ ان مصنفین کی تخلیقات ہر دور میں نئے علمی انکشافات کے ساتھ وارد ہوئیں۔ چونکہ ادبیات عالم میں انسانی تہذیب و تمدن کی شناخت وبازیافت میں مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ ترجمے کا مرکزی کردار رہا اس لئے ادب کے ترقی وتوسیع میں ترجمے نے بنیادی اور سفارتی پل کا کام کیا۔ ترجمہ بنیادی طور پر ان قوموں کی ضرورت ہوتا ہے جن میں علم کی طلب کا شعور ہو اس لئے اردو ادب میں ترجمے کی اہمیت مسلم رہی۔

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

اردو ادب میں ایسے مصنفین کی فہرست خاصی طویل ہے جنھوں نے مختلف زبانوں کا ادب اردو زبان میں ترجمے کے زریعے منتقل کیا جس کی وجہ سے اردو زبان میں وسعت پیدا ہوئی۔ اردو ادب کی اہم ادبی شخصیات میں ایک اہم نام "مسعود اشعر" کا ہے۔ مسعود اشعر ۱۰ فروری ۱۹۳۰ کو رام پور انڈیا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک الہ آباد اور انٹر آگرہ سے مکمل کیا۔ آپ نے 1951 میں پاکستان ہجرت کی اور روزنامہ امروز سے منسلک ہوئے۔ حکومت پاکستان نے ۱۴ اگست ۲۰۰۹ کو انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن وکارکردگی عطا کیا[1]۔ مسعود اشعر اردو کے نامور افسانہ نگار، کالم نویس اور مترجم ہیں۔ آپ کے افسانوں کا "انتخاب" آصف فخری نے آکسفورڈ پریس سے شائع کرایا۔ مسعود اشعر کے کالم "روزنامہ جھنگ" میں شائع ہوئے۔ آپ نے بہت سی کتابوں کے تراجم اردو میں کئے۔ امریکی مصنف "روبرٹ ایلن" کی تخلیق " How to Save the World: Strategy for World Conservation" کا ترجمہ مسعود اشعر نے "دنیا کو تباہی سے کیسے بچانا چاہیے" کے عنوان سے کیا۔ یہ کتاب پروگریسو پبلشرز نے مشعل بکس کے ساتھ مل کر شائع کی۔ مشعل پاکستان کا ایک اشاعتی ادارہ ہے جو ۱۹۶۸ء میں لاہور میں رجسٹرڈ ہوا اور فاؤنڈیشن کی صورت اختیار کر گیا۔ اس ادارے کی طرف سے اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر کتابیں شائع ہوئیں۔ یہ کتاب بھی ۱۹۹۲ء میں اس ادارے کی طرف سے شائع ہوئی۔ ڈیوڈ اے فرو (ڈائریکٹر جنرل آئی یو سی این) اس تصنیف کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> "بقائے عالم کی یہ حکمتِ عملی آئی یو سی این نے دوسرے اداروں کی مدد سے تیار کی اور اس کے لیے مالی امداد فراہم کی۔ اس حکمتِ عملی کا قطعی مسودہ اقوام متحدہ کے ادارہ خوراک و زراعت اور یونیسکو کے علاوہ یو این ای سی اور ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ کو بھیجا گیا جس پر انہوں نے نظر ثانی کی اگرچہ یہ کتاب اس حکمتِ عملی کی غیر سرکاری شکل ہے لیکن اس حکمتِ عملی کی طرح مذکورہ اداروں کی تائید و حمایت حاصل ہے۔"[2]

ڈیوڈ اے فرو کا خیال ہے کہ دُنیا کے وسائل حیات کو بچانے کی روش بہت قدیم ہے اور مغرب میں خاص کر اس کو بچانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ کرہ ارض کو تباہی سے بچایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی معاشی اور معاشرتی تگ و دو میں اس مسئلے کو فوری اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ دُنیا کی حکمتِ عملی ظاہر کرتی ہے کہ ترقی یعنی انسانی ضروریات کی تکمیل اور حیات انسانی کا بلند معیار کرنے کا انحصار فطرت کا تحفظ اور بقا ہے اور اگر فطرت کا تحفظ ہو

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

جائے تو انسانی ترقی ممکن ہو جاتی ہے۔ اگر ہم ماحول کو خوش گوار بنانے کی کوشش کریں تو حکمتِ عملی مسلسل ترقی کی رفتار میں اضافہ کرتی ہے۔

کرہ ارض کا تحفظ ہی انسانی ترقی کی اصل قوت محرکہ ہے۔ کیوں کہ یہ فطرت کا حصہ ہیں اس لیے ہمارے تمام اعمال بھی فطرت کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس طرح ہی ہم کرہ ارض کو بچا سکتے ہیں۔ سر پیٹر اسکاٹ جو (چیئر مین ورلڈ ورلڈ لائف فنڈ) ہیں کرہ ارض کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

> "۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں رائج انسان کے یہ پر اعتماد دعوے کہ وہ اپنے مسائل کا حل تلاش کرے گا، ایک نئی قسم کی عاجزی اور انکساری میں بدل گئے ہیں۔ یہ عاجزی اس احساس نے پیدا کی ہے کہ بنی نوع انسان کی حیرت انگیز کامرانیاں بھی کرہ ارض اور اس پر موجود نباتات اور جانداروں کو نہیں بچا سکتیں۔ تحفظ کی حکمتِ عملی اس امر کا تقاضہ کرتی ہے کہ عناصر فطرت کے ساتھ ہم آہنگ رہ کر ہی انسان اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔"(۳)

تعلیم کے بارے میں بھی اس فاؤنڈیشن کی طرف سے" Modren Philosophy of Education" کتاب شائع ہوئی اس کے مصنف اقبال خان اور اس کا ترجمہ مسعود اشعر نے "جدید تعلیمی فلسفہ" کے عنوان سے کیا۔ اس کتاب کو تخلیقات نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے اس کتاب میں تعلیم کی اہمیت اور فلسفے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ کتاب میں مغربی ملکوں کی ترقی کا راز تعلیم کو بتایا گیا ہے۔ مغربی ملکوں میں تعلیم کسی حد تک سائنس کا درجہ اختیار کر چکی ہے اور سائنس میں ترقی مغربی ممالک میں تیزی سے ہو رہی ہے۔ لیکن تعلیم میں ترقی انہیں معاشروں میں ہو سکتی ہے جو کھلے معاشرے ہوں جن کو علم کی قدر ہو اور جو انسان کی ترقی دِلی طور پر کرنے کے خواہش مند ہوں۔

غالب احمد جو سابق چیئر مین ٹیکسٹ بک بورڈ پنجاب اور سابق سینئر ماہر نفسیات، پاکستان ایئر فورس ہیں۔ ان کا پاکستانی معاشرے کی تعلیم کے بارے میں خیال ہے:

> "ہماری بد قسمتی یہ رہی ہے کہ ہم نے اپنے ملک میں جمہوری آزادیوں کی جڑیں ڈالنے کی کوششیں کیں نہ ہی تعلیمی نظام کے مسئلے پر تعمیری انداز میں سوچا۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دور میں ایک تعلیمی پالیسی تشکیل تو دی گئی جو پروفیسر ایس ایم شریف کی سربراہی میں

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

مرتب ہوئی تھی۔ یہ محض انتظامی امور کو طے کرنے کے لیے ایک تعلیمی توسیع کا پروگرام تھا۔ جو بیرونی امداد کے بل بوتے پر بنایا گیا تھا۔ اس پالیسی پر کبھی مکمل طور پر عمل نہیں ہو سکا۔"(۴)

لیکن اس دور میں یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ پانچ چھ اعلیٰ تعلیم کے جامعات قائم ہو گئے۔ ایوب خان کے دورِ حکومت کے بعد جب بھٹو کا دورِ حکومت آیا اس میں تعلیم کو محض سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ یہ رویہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اور زور پکڑتا گیا اور اب تک جاری ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ملازمت کے مواقع تو عوام کو دیئے گئے مگر تعلیم کی اہمیت اور اس کے معیار کو نہیں بڑھایا گیا۔ ہمارے قومی وسائل کو ہر دورِ حکومت میں بہت ضائع کیا گیا ہے۔ لیکن تعلیم جیسے مسائل پر بہت کم رقم خرچ کی گئی ہے اور جو رقم اس غرض کے لیے ہمارے قومی بجٹوں میں دی گئی ہے اس کو زیادہ تر ایجوکیشنل بیوروکریسی پر اور غیر تعلیمی کاموں پر خرچ کیا گیا ہے۔

غالب احمد کہتے ہیں:

"پروفیسر عبدالسلام نے ہمیں بتایا ہے کہ تقریباً تین ہزار ڈالر سالانہ ایک پاکستانی سپاہی پر اور اس کے دفاعی وسائل پر خرچ کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ایک پاکستانی طالب علم پر ہر سال صرف تین ڈالر خرچ کرتے ہیں۔"(۵)

غالب احمد کا تعلیم کے بارے میں نقطہ نظر ہے کہ اگر اپنے ملک کو سنبھالنا ہے۔ تو ہمیں جہالت سے اپنی قوم کو دور رکھنا ہو گا۔ تعلیم کو ترقی دینے کے لیے نہ صرف زیادہ رقم کی ضرورت ہے بلکہ ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو بدلنا ہو گا اور ہمیں استادوں کی تربیت اور قوم کو تعلیم کے بارے میں شعور و آگہی دینا ہو گی۔

غالب احمد مسعود اشعر کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"جدید تعلیمی فلسفہ میں جو مضامین شامل ہیں ان میں سے کئی فکری لحاظ سے کافی مشکل ہیں اور کئی جگہ کافی تکنیکی بھی۔ مسعود اشعر صاحب نے ان مضامین کا بہت محنت سے ترجمہ کیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی ہے کہ مضامین کو عام فہم بنایا جائے ان کی یہ کوشش اردو زبان کی بھی قابلِ قدر خدمت ہے۔"(۶)

مسعود اشعر کی ایک اور ترجے کی کاوش ضیاء الدین سردار کا ناول "Search of Heaven" کا ترجمہ "جنت کے لیے سرگرداں ہے" کے عنوان سے کیا۔ اس ناول کا مرکزی خیال یہ ہے کہ دینی فرائض کے ساتھ ساتھ

دنیاوی فرائض بھی ادا کرنے چاہئیں ان کے خیال میں تبلیغ کا کام مسلمان یورپ میں عیسائیوں کی طرح ہی کرتے ہیں۔ جو گھر گھر جا کر اپنا وعظ لوگوں کو سناتے ہیں۔ اس حوالے سے ناول میں موجود جملے مسعود اشعر کی ترقی پسندانہ سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

> "معلوم ہوا کہ مسعود صاحب کا اپنا مرچ مصالحے کا کاروبار ہی نہیں اپنی بیوی اور آٹھ بچوں کو بھی پاکستان میں چھوڑ آئے ہیں تاکہ یورپ میں تبلیغ کا کام کر سکیں اور مسلمانوں کو مسجد میں بلا سکیں۔ تبلیغ کا یہ کام ان امریکی عیسائیوں کی طرح ہے جن کا کوئی نہ کوئی گروہ اس مقصد کے لیے اپنا سال دو سال وقف کر دیتا ہے۔ یہ لوگ مومن کہلاتے ہیں اور شہر شہر گھوم کر اجنبی لوگوں کے دروازے کھٹ کھٹا کر اپنا رٹا رٹایا وعظ سناتے ہیں اور اپنے عقیدے کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"(۷)

مسعود اشعر نے ایک اور ناول "Scars of the David" کا "زخم کا نشان" کے عنوان سے بھی ترجمہ کیا۔ اس ناول کی مصنفہ "سوزن ابوالہوا" ہیں۔ سوزن ابوالہوا امریکہ میں رہتی ہیں جب کہ فلسطین میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والدین ۱۹۶۷ء میں چھ روز عرب اسرائیلی جنگ کے نتیجے میں گھر سے بے گھر ہو کر پناہ گزیں بن جانے پر مجبور ہو گئے تو ان کی آبائی زمین پر قبضہ ہو گیا۔ مسعود اشعر لکھتے ہیں

> "فلسطین کے بارے میں مغرب کے ذرائع ابلاغ، خصوصاً امریکی اخبارات کے متعصب عکاسی نے سوزن ابوالہوا کو بہت بددل اور برہم کیا۔ اس کے بعد انہوں نے امریکہ کے مختلف اخبارات میں لکھنے کا آغاز کر دیا۔ ان کی یہ اخبار تحریریں جن کو پاکستان کی صحافت کے انداز میں کالم اور امریکی اخبارات "op-ed" کہا جاتا ہے۔ ممتاز ترین اخبارات میں شائع ہوئیں۔ جن میں نیویارک ڈیلی نیوز، شکاگو ٹری بیون، کرسچین، سائنس مانیٹر، فلاڈیلفیا انکوائرر شامل ہیں۔"(۸)

جب ۲۰۰۲ء میں خبریں آنے لگیں کہ جن میں پناہ گزینوں کی بستی کو جلا دیا گیا تو انہوں فلسطین کا سفر کیا۔ سوزن ابوالہوا نے فلسطین کا سفر کیا۔ انہوں نے وہاں جو درندگی دیکھی اس کا پکا ارادہ کر لیا کہ جنہیں یہاں جن مصائب کا فلسطینوں کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ اس کی کہانی لکھیں گی۔

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

جینین سے واپس آنے کے بعد انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک فلاحی ادارہ قائم کیا ان فلسطینی بچوں کے لیے جو محکوم اور مقبوضہ علاقے میں رہنے والے تھے تا کہ اس میں کھیل سکیں۔ اس نے اس ادارے کا نام "Play grounds for palestine, Inee" رکھا اور پھر اس ادارے کے تحت ہی بیت الحلم، رافہ، خان یونس اور ہیرون میں کھیل کے میدان قائم کیے۔ سوزن ابوالہوا اس کا پہلا ناول ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا اس کا م "The sear of David" تھا۔ اشاعت کے بعد جب ان کا ناول شائع ہوا تو بعض حلقوں میں اس کی مخالفت کی گئی وہاں اس کو ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔ مسعود اشعر لکھتے ہیں:

> "اس ناول کا اردو ترجمہ، مصنفہ اور ناشر کی باضابطہ اشاعت کے بعد کیا جا رہا ہے۔ اس ترجمے کے محرک محترم عارف سید صاحب ہیں۔ جو امریکہ میں رہتے ہیں۔ انہی کی تحریک پر ضیاء الدین سردار کی کتاب کا اردو ترجمہ "جنت کے لیے سرگرداں" کیا گیا تھا۔ سید صاحب مسلمانوں اور مسلم معاشروں کی موجودہ صورتِ حال پر فکر مند رہتے ہیں اور اس موضوع پر چھپنے والی انگریزی کتابیں ترجمے کے ذریعے اردو پڑھنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔"(۹)

اس ناول کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں ایک ایسے لڑکے کی کہانی بیان کی گئی ہے جیسے ایک یہودی خاندان نے پالا۔ وہ لڑکا اس خاندان کو اس وقت ملا جس پر ۱۹۴۸ء میں اس نے قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں پر جو ظلم ہوئے اس کی کہانی ناول میں بیان کر دی گئی ہے۔ سوزن ابوالہوا لکھتی ہیں:

> "اس ناول کے کردار تو خیالی ہیں، مگر فلسطین خیالی نہیں ہے اور نہ وہ تاریخی واقعات خیالی ہیں جو اس کہانی میں بیان کیے گئے ہیں۔ یقیناً مشرق وسطیٰ کے تنازع کے بیان میں خیال آرائی اصل حقیقت کے مقابلے میں بہت ہی کمزور اور ناموزوں متبادل ہے۔ میں نے اپنی یادداشت اور ریکارڈ کی ہوئی تاریخ کی مدد سے حتی المقدور دیانت داری کے ساتھ واقعات اور تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے کئی تحریری مآخذ پر انحصار کیا ہے جن کا ذکر حوالہ جات میں کر دیا گیا ہے یا بعض جگہ اصل میں انہیں شامل کر لیا گیا ہے۔"(۱۰)

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

فلسطین کے مسئلے پر سب سے اچھا اور عظمت کے ساتھ جس نے لکھا وہ ایڈورڈ سعید جیسے ادیب کا نام ہے۔ اس کتاب کی تخلیق میں ایڈورڈ سعید کے افکار کی چھاپ کی عکاسی نظر آتی ہے۔ سوزن ابوالہوا اظہارِ خیال کرتی ہیں:

"ایک مرتبہ انہوں نے اس افسوس کا اظہار کیا تھا کہ تخلیقی ادب میں فلسطین کا بیانیہ مفقود ہے۔ ان کی اس مایوسی کو میں نے اپنے عزم مصمم کی بنیاد بنا لیا۔ انہوں نے جس فکری عظمت، اخلاق، استقامت اور متعدی جوش و خروش کے ساتھ فلسطین کے حقوق کے لیے پیش قدمی کی اس نے کئی حوالے سے ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑا ہے۔ میرے لیے وہ ظاہری شخصیت سے بھی زیادہ بڑی شخصیت تھے۔"(۱۱)

فلسطین کے متعلق جتنی کتابیں بھی لکھی گئیں ہیں۔ اس میں ہر فلسطینی ادیب اپنا بنیادی ماٰخذ ایڈورڈ سعید کی کتابوں کو سمجھتا ہے۔ اس طرح کی ایک تخلیق کا ترجمہ مسعود اشعر نے کیا ہے۔ اس کا نام ہے "یورپ مسلمانوں کی نظر میں" یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف کے تخلیق کار کا نام، "برنارڈ لیوس" ہے۔ اس کے حوالے سے سید عارف علی لکھتے ہیں:

"برنارڈ لیوس ایک معتبر مورخ ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ کی مدت سے صرف اسلام اور عرب ممالک کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ آج ان کی عمر نوے سال سے زیادہ ہے۔ یہ اپنی محنت شاقہ سے مرتب کردہ تاریخ کے وسیلے سے ایک مدت تک ہمارے احترام کے مستحق رہیں گے۔ ان کی کتابوں کا ترجمہ دُنیا کی تیس مہذب زبانوں میں ہو چکا ہے مگر افسوس اس بات کا ہے۔ کہ ان کی ایک بھی کتاب کا ترجمہ اسلامی ممالک کی زبانوں میں ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ اردو ترجمہ اور بنگالی ترجمہ اس کی شروعات ہے۔"(۱۲)

اِس کتاب کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ آج تک ہمیشہ یہ لکھا جاتا رہا ہے کہ مغربی نظر میں مشرق کی کیا اہمیت ہے اور مشرق والے مغرب کو کس طرح سمجھتے ہیں۔ مسلمان آٹھویں صدی میں جب یورپ آئے استنبول کے قبضے کے بعد مسلم افواج اٹلی اور فرانس جا پہنچیں اگر اس وقت جنوبی مغربی فرانس کے قیام پر مسلمانوں کو شکست نہ ہوتی تو آج مسلمان اس حالت میں نہ ہوتے اور ان کی تاریخ اس طرح نہ لکھی جاتی جس طرح آج لکھی جا رہی ہے۔ اسپین میں بھی مسلمان ادیبوں، شاعروں اور فلسفیوں کی ایک بڑی تعداد دیکھنے میں آئی۔ یہی نہیں بلکہ مسلمان یہاں

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

سائنس دان اور انجنیئر بن کر پورے یورپ میں علم و دانش کے ایک نئے دور کا آغاز کرنے لگے۔ اس طرح قدیم یورپ کی کئی کلاسیکی تخلیقات کا ماخذ عربی ادب وروایات ہیں۔ بعد میں عثمانی فتوحات نے ان روایات اور اس تہذیب کو یورپ کے وسیع علاقوں تک پھیلا دیا ہے۔ مسعود اشعر اس بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

> "برنارڈ لیوس اسے مسلمانوں کی دریافت کہتا ہے۔ یعنی مسلمانوں نے یورپ کو علمی اور فکری سطح پر کے لیے دریافت کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے مسلمان سیاحوں، یورپ جانے والے عام مسلمانوں، مسافروں، مسلمان، سفارتی نمائندوں، مسلم مورخوں اور سرکاری حکام وہاں کے روزنامچوں، روداد وں، رسالوں، کتابوں، مخطوطوں اور خط وکتابت کو کھنگالا ہے۔ اس کی تحقیق و تفتیش یہ سلسلہ قریب قریب طلوع اسلام سے شروع ہوتا ہے اور بیسیویں صدی کے اوائل تک جاری رہتا ہے۔ مصنف نے اپنا نقطہ نظر ثابت کرنے کے لیے بہت محنت کی ہے ایسے ایسے مخطوطے تلاش کیے ہیں جن تک اس سے پہلے کسی کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی اپنی تحریروں سے ہی اپنے دعوے کی بنیاد مضبوط بنائی ہے۔"(۱۳)

مسعود اشعر کا خیال ہے کہ برنارڈ خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ جب بھی کوئی قوم دوسری قوم پر فتح حاصل کر لیتی ہے تو خود پسندی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر یہ خوبی نمایاں طور پر نظر آنے لگتی ہے۔ آج کی مثال ہمارے سامنے ہے جب مسلمان فاتح تھے تو تب انہیں اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے علم و فکر پر ناز تھا اور جب مسلمانوں کو عروج تھا تو تب ان کے پاس مسلمانوں کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ جب مسلمانوں کے اندر یہ ذہنیت اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے ساتھ پختہ ہو گئی تو یورپ کے پاس دینے کو بہت کچھ آ گیا تو اس وقت بھی اسے نفرت سے ہی دیکھتے تھے اور اس کی ترقی و خوش حالی کو حقیر اور کمتر ہی گردانتے رہے۔ اس وجہ سے ہمارے سامنے آج یہ نتائج آرہے ہیں۔ مسعود اشعر لکھتے ہیں۔

> "حقیقت یہ ہے کہ یورپ یا مغرب نے بھی ابتداء میں اسلام اور مسلمانوں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اس کی تاریخ، اس کے عقائد اور اس کے عملی و فکری کاوشوں کو مسخ کرنے اور اس کے خلاف نفرت پھیلانے کی ہر ممکن سعی کی تھی۔ یہ سلسلہ پہلی صلیبی جنگ سے شروع ہوا اور کسی نہ کسی حد تک بیسویں صدی تک جاری رہا۔ ان کی

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

تحریروں میں جنگ جو عیسائیوں کے خلاف لڑنے والے مسلمانوں کی جو تصویریں پیش کی گئی ہیں وہ کسی طرح بھی انسان نظر نہیں آتے بلکہ ایسے سفاک عفریت دکھائی دیتے ہیں جن سے درندے بھی پناہ مانگیں۔"(۱۴)

عیسائیوں نے جب سپین پر دوبارہ قبضہ کیا تو انہیں وہاں ایسا سیاسی معاشی و معاشرتی نظام نظر نہ آیا جس میں مذہبی یا نسلی منافرت ہوتی لیکن مغرب نے دانستہ طور پر اسے نظر انداز کیا اور مذہب کے نام پر پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ اس طرح پھر قتل و غارت کا بازار سر گرم ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ کیتھولک فرقے کا رہنما اتنا روشن خیال نہیں مانا جاتا تھا جتنا پروٹسٹنٹ طبقے کا مارٹن لوتھر مانا جاتا تھا۔ اس نے بھی جب مسلمانوں کو جاننے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا کہ مسلمان بت پرست ہیں۔ مسلمانوں کو اس وقت صحیح طور پر سمجھا جانے لگا جب مصر پر قبضہ ہوا۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اسلام اور مغرب کے رشتوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں یورپ اور مسلمانوں کے درمیان اظہار و ابلاغ کا ذریعہ کیا تھا ترجمانی کیسے ہوئی؟ کن لوگوں نے کی اس کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں اقتصادی امور، حکمرانی اور عدل و انصاف، سائنس اور ٹیکنالوجی ادب اور فنون لطیفہ اور عوام اور معاشرے پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

مسعود اشعر کا خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان جو بھی تعلق رہا ہو وہ کسی طرح کے بھی حالات ہوں ہمیشہ مکالمے کی صورت رہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ مغرب نے اگر مسلمانوں کے بارے میں کوئی تصور دیا تو مسلمانوں نے کو ویسا ہی سمجھا گیا لیکن اگر مسلمانوں نے مغرب کے بارے میں کوئی تصور دیا تو اسے کسی نے اہمیت ہی نہیں دی۔ مغرب اور اس تاریخ کے بارے میں مسعود اشعر کا اپنا نقطہ نظر ہے۔ افسانے کے بارے میں بھی وہ اپنا ایک خاص موقف رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"میرے افسانے دراصل میرے خواب بلکہ بے شتر میرے ڈراؤنے خواب ہیں اور افسانہ لکھ کر میں اپنے ڈراؤنے خوابوں سے نجات حاصل کرتا ہوں یعنی اس قسم کا کتھارس ہو جاتا ہے۔"(۱۵)

مسعود اشعر مغرب کے بارے میں اور مشرق کی تاریخ و اصناف کے بارے میں اپنا ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ کوئی بھی ادیب ہو وہ ہر چیز کو اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور پھر اسے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ مسعود

اشعر نے بھی انگریزی کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا تو وہ بہت اچھے انداز سے اپنی ترجمہ کی ہوئی تحریریں ہمارے سامنے لائے جس سے ہم ان کے نقطہ نظر کو سمجھ سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. Tareek-e-Pakistan, Retrieved from http://www.tareekhepakistan.com/detail?title_id=2706&dtd_id=2583

۲۔ مسعود اشعر، مترجم، دنیا کو تباہی سے کیسے بچانا چاہیے، لاہور: پروگریسو پبلیشرز، ۱۹۹۲ء، ص۸

۳۔ ایضاً، ص۱

۴۔ اقبال خان، جدید تعلیمی فلسفہ، مترجم: مسعود اشعر، تخلیقات، لاہور: ۱۹۹۲ء، ص۶

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً، ص۷

۷۔ ضیاء الحق سردار، جنت کے لیے سرگرداں، مترجم: مسعود اشعر، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشرز، ۲۰۰۸ء، ص۹

۸۔ مسعود اشعر، مترجم، سوزن ابوالہوا، زخم کا نشان، کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۰ء، ص۷

۹۔ ایضاً، ص۶

۱۰۔ ایضاً، ص۷

۱۱۔ ایضاً، ص۹

۱۲۔ برنارڈ لیوس، یورپ مسلمانوں کی نظر میں، مترجم: مسعود اشعر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص۵

۱۳۔ ایضاً، ص۸

۱۴۔ ایضاً، ص۹

۱۵۔ مسعود اشعر، سارے افسانے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز: ۱۸۹۷ء، ص۲